سید منظور الحسن

سنت کا ثبوت

جناب جاوید احمد غامدی صاحب کے موقف پر اعتراضات کا جائزہ

(۳)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۲۔ اخبار آحاد میں دین کے فروعات

امام شافعی نے اخبار آحاد کے طریقے پر ملنے والے دین کو ''اخبار الخاصہ'' سے تعبیر کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ یہ علم دین کا وہ حصہ ہے جو فرائض کے فروعات سے متعلق ہے۔ ہر شخص اسے جاننے اور اس پر عمل کرنے کا مکلف نہیں ہے۔ لکھتے ہیں:

قلت له: ما ينوب العباد من فروع الفرائض، وما يخص به من الأحكام وغيرها، مما ليس فيه نص كتاب، ولا في أكثره نص سنة، وإن كانت في شيء منه سنة فإنما هي من أخبار الخاصة، لا أخبار العامة، وما كان منه يحتمل التأويل ويستدرک قياسًا.

قال: فيعدو هذا أن يكون واجبًا وجوب العلم قبله؟ أو موضوعًا عن

''میں نے کہا: (دوسری قسم) اس علم پر مشتمل ہے جو ان چیزوں سے متعلق ہے جو مسلمانوں کو فرائض کے فروعات میں پیش آتے ہیں یا وہ چیزیں جو احکام اور دیگر دینی چیزوں کی تخصیص کرتی ہیں۔ یہ ایسے امور ہوتے ہیں جن میں قرآن کی کوئی نص موجود نہیں ہوتی اور اس کے اکثر حصہ کے بارے میں کوئی منصوص قول رسول بھی نہیں ہوتا، اگر کوئی ایسا قول رسول ہو بھی تو وہ اخبار خاصہ کی قبیل کا ہوتا ہے، نہ کہ اخبار عامہ کی طرح کا۔ جو چیز اس

الناس علمه، حتی یکون من علمه منتفلًا ومن ترک علمه غیر آثم بترکه؟ أو من وجه ثالث، فتوجدناه خبرًا أو قیاسًا؟

فقلت له: بل هو من وجه ثالث.

قال: فصفه واذکر الحجة فیه، ما یلزم منه، ومن یلزم، وعن من یسقط؟

فقلت له: هذه درجة من العلم لیس تبلغها العامة، ولم یکلفها کل یعطلوها، ومن احتمل بلوغها من الخاصة فلا یسعهم کلهم کافة أن یعطلوها، وإذا قام بها من خاصتهم من فیه الکفایة لم یخرج غیره ممن ترکها، إن شاء الله، والفضل فیها لمن قام بها علی من عطلها.

(الرسالہ ۳۵۹-۳۶۰)

طرح کی ہوتی ہے، وہ تاویل بھی قبول کرتی ہے اور قیاساً بھی معلوم کی جاسکتی ہے۔

سائل نے سوال کیا کہ پہلی قسم کے علم کی طرح کیا اس علم کو جاننا بھی فرض نہیں ہے؟ یا پھر اگر اس کا جاننا فرض نہیں ہے تو کیا اس کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس علم کا حصول ایک نفلی عمل ہے اور جو اسے اختیار نہیں کرتا، وہ گناہ گار نہیں ہے؟ یا کوئی تیسری بات ہے جو آپ کسی خبر یا قیاس کی بنیاد پر واضح کرنا چاہیں گے؟

میں نے کہا: ہاں، اس کا ایک تیسرا پہلو ہے۔

اس نے کہا: اگر ایسا ہے تو پھر اس کے بارے میں بیان کیجیے اور اس کے ساتھ اس کی دلیل بھی واضح کیجیے کہ اس کے کون سے حصے کو جاننا لازم ہے اور کس پر لازم ہے اور کس پر لازم نہیں ہے؟

میں نے بیان کیا کہ یہ علم کی وہ قسم ہے جس تک عامۃ الناس رسائی حاصل نہیں کر پاتے۔ تمام خواص بھی اس کے مکلف نہیں ہیں، تاہم جب خاصہ میں سے کچھ لوگ اس کا اہتمام کر لیں (تو کافی ہے، البتہ) خاصہ کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ تمام کے تمام اس سے الگ ہو جائیں۔ چنانچہ جب خواص میں سے بقدر کفایت لوگ اس کا التزام کر لیں تو باقی پر کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ اس کا التزام نہ کریں۔ البتہ التزام نہ کرنے والوں پر التزام کرنے والوں کی فضیلت بہر حال قائم رہے گی۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

امام شافعی نے ''کتاب الام'' میں بھی اطلاقی پہلو سے اسی بات کو بیان کیا ہے:

ویعلم أن علم خاص السنن إنما هو علم خاص لمن فتح الله عزوجل له علمه لا أنه عام مشهور شهرة الصلاة وجمل الفرائض التي كلفتها العامة. (۱۶۷/۱)

''اور یہ جاننے کے لیے کہ خاص سنن، (یعنی احادیث) کا علم تو صرف اس شخص کے ساتھ خاص ہے جس کے لیے اللہ عزوجل اپنے علم کے دروازے کھول دے، نہ کہ وہ نماز اور دیگر تمام فرائض کی طرح مشہور ہے جن کے تمام لوگ مکلف ہیں۔''

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اہل علم کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ منصبی ذمہ داری تھی کہ اصل اور اساسی دین آپ کے ذریعے سے بے کم و کاست اور پوری قطعیت کے ساتھ امت کو منتقل ہو۔ لہٰذا آپ نے اصل اور اساسی دین سے متعلق تمام امور کو صحابہ کو منتقل کیا اور اپنی براہ راست رہنمائی میں اس طرح رائج اور جاری و ساری کر دیا کہ اسے اجتماعی تعامل کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ آپ کے اس اہتمام کے بعد ان امور کا تعامل اور عملی تواتر سے نسل در نسل منتقل ہوتے چلے آنا لازم اور بدیہی امر تھا۔ لہٰذا ایسا ہی ہوا اور اصل اور اساسی دین کسی تغیر و تبدل اور کسی سہو و خطا کے بغیر نسلاً بعد نسلٍ امت کو منتقل ہوتا چلا گیا۔ اصل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دین کو بے کم و کاست اور پوری قطعیت کے ساتھ منتقل کرنے کا مکلف ہونا اس بات کو لازم کرتا ہے کہ اصل اور اساسی دین کو انتقال علم کے قطعی ذریعے ـــــ اجماع و تواتر ـــــ پر منحصر قرار دیا جائے۔ اگر اسے اخبار آحاد پر منحصر مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے انسانوں تک دین پہنچانے کی ذمہ داری کو نعوذ باللہ لوگوں کے انفرادی فیصلے پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ چاہیں تو اسے آگے پہنچائیں اور چاہیں تو نہ پہنچائیں اور یاد رہے تو پوری بات بیان کر دیں، بھول جائیں تو ادھوری ہی پر اکتفا کر لیں۔ یہ ماننا، ظاہر ہے کہ 'اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ'[1] اور 'مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ'[2] کے نصوص کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماے امت بجا طور پر یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اصل دین تواتر اور تعامل ہی سے نقل ہوا ہے اور اخبار آحاد میں متواتر اور مجمع علیہ دین کے جزئیات اور فروعات ہی پائے جاتے

۱۔ المائدہ ۵: ۳۔ ''آج کے دن میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو کامل کر دیا۔''

۲۔ الاحزاب ۳۳: ۴۰۔ ''محمد تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔''

ہیں۔اس بنا پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ناقدین اگر یہ تسلیم کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دین کو پورے اہتمام، پوری حفاظت اور پوری قطعیت کے ساتھ لوگوں تک پہنچانے کے مکلف تھے تو انھیں لازماً یہ ماننا پڑے گا کہ کوئی چیز ایسی نہیں ہو سکتی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دینی امر کے طور پر صحابہ میں عملاً جاری کی ہو اور وہ بعد میں اخبار آحاد پر منحصر رہ گئی ہو۔

جہاں تک ناقدین کی اس بات کا تعلق ہے کہ تواتر، دین کے نقل کا ذریعہ ہے اور ذریعے کی بنیاد پر کسی چیز کے دین ہونے یا نہ ہونے میں فرق کرنا درست نہیں ہے، تو اس میں تو کوئی شبہ نہیں ہے کہ دین منتقل کرنے کا ذریعہ بذات خود دین نہیں ہوتا، لیکن اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ یہ ذریعہ ہی ہے جس کے قوی یا ضعیف ہونے کی بنا پر کسی چیز کے دین ہونے یا دین نہ ہونے کا فیصلہ ہوتا ہے۔ دین کے ذرائع کی اہمیت اس قدر ہے کہ خود خدا نے ایک جانب ان کی حفاظت کا غیر معمولی اہتمام کیا ہے اور دوسری جانب ان ذرائع پر اعتماد کو ایمان کا جزو لازم قرار دیا ہے۔ ان میں سے ایک ذریعہ اللہ کے مقرب فرشتے جبریل علیہ السلام ہیں، جنھیں قرآن نے صاحب قوت، مطاع اور امین اسی لیے کہا ہے کہ ان کی قوتوں اور صلاحیتوں کی بنا پر اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ کوئی دوسری قوت یا ارواح خبیثہ انھیں کسی بھی درجے میں متاثر یا مرعوب کر سکیں یا خیانت پر آمادہ کر لیں یا خود ان سے اس وحی میں کوئی اختلاط یا فروگذاشت ہو جائے۔ اس طرح کی تمام کمزوریوں سے اللہ تعالیٰ نے انھیں محفوظ کر رکھا ہے۔

محدثین نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ہونے والی روایتوں کو جب مختلف اقسام میں تقسیم کیا تو اصل میں ذریعے ہی کو بنیاد بنا کر تقسیم کیا۔ جس روایت میں انھیں یہ ذریعہ زیادہ قوی محسوس ہوا، اسے انھوں نے خبر متواتر قرار دیا۔ ذریعے ہی کے قوی ہونے کی بنا پر روایات کو صحیح اور حسن قرار دے کر مقبول اور لائق حجت قرار دیا گیا اور ذریعے ہی کے ضعف کی بنا پر انھیں ضعیف، معلق، مرسل، معضل، منقطع، مدلس، موضوع، متروک، منکر اور معلل کہہ کر مردود قرار دیا گیا۔

ذریعے کی صحت اور عدم صحت اور قوت اور ضعف کی بنا پر کسی چیز کو دین ماننے یا نہ ماننے کا فیصلہ اگر اخبار آحاد کے ذخیرے میں کرنا سراسر درست ہے تو دین کے پورے ذخیرے میں اس بنا پر فیصلہ کرنا کیسے غلط ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انتقال علم کا ذریعہ ہی اصل میں یہ فیصلہ کرتا ہے کہ بہ اعتبار نسبت کون سی بات قطعی ہے اور کون سی ظنی ہے۔ تعجب ہے کہ یہ بات بیان کرتے ہوئے ناقدین نے اس حقیقت واقعہ کو کیسے نظر انداز کر دیا کہ

اصل دین کا قطعی الثبوت ہونا ہی اسلام کا باقی مذاہب سے بنیادی امتیاز ہے، ورنہ اگر دین کے اصل اور اساسی احکام بھی اس طرح دیے گئے ہیں کہ ان کے ثبوت میں اختلاف اور بحث و نزاع کی گنجایش ہے تو پھر دوسرے مذاہب اور اسلام میں استناد کے لحاظ سے کوئی فرق ہی باقی نہیں رہتا۔

یہاں یہ واضح رہے کہ جب کوئی صاحب علم خبر واحد کے مقابلے میں قولی و عملی تواتر کو ترجیح دیتا ہے یا اخبار آحاد پر تواتر عملی کی برتری کا اظہار کرتا ہے یا قرآن کی کسی آیت کے مقابلے میں خبر واحد کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے یا مسلمات عقل و فطرت کی بنا پر کسی روایت کے بارے میں توقف کا فیصلہ کرتا ہے تو یہ کوتاہ فہمی ہے کہ اس کے بارے میں یہ حکم لگایا جائے کہ اس نے نعوذ باللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کا انکار کرنے کی جسارت کی ہے۔ اس کی اس ترجیح، اس انکار، اس تردید اور اس توقف کے معنی صرف اور صرف یہ ہوتے ہیں کہ اس نے اس خبر واحد کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کی صحت کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ مزید برآں اہل علم کے نزدیک کوئی روایت اگر سند کے اعتبار سے صحیح کے معیار پر پوری اترتی ہے تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ وہ فی الواقع حدیث رسول ہے۔ اس کے معنی صرف اور صرف یہ ہیں کہ اس روایت کو حدیث رسول کے طور پر ظن غالب کی حیثیت سے قبول کرنے کے اہم شرائط میں سے ابتدائی شرط پوری ہو گئی ہے۔ اس کے بعد انھیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ روایت قرآن و سنت کے خلاف تو نہیں ہے، عقل و فطرت کے مسلمات سے متصادم تو نہیں ہے۔ اس زاویے سے روایت کو پرکھنے کے بعد فہم حدیث کے حوالے سے وہ یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ روایت کا مفہوم عربی زبان کے نظائر کی بنا پر اخذ کیا جائے، اسے قرآن مجید کی روشنی میں سمجھا جائے، اس کا مدعا و مصداق موقع و محل کے تناظر میں متعین کیا جائے اور موضوع سے متعلق دوسری روایتوں کو بھی زیر غور لایا جائے۔ یہ اور اس نوعیت کے دیگر پہلوؤں کا لحاظ کیے بغیر جلیل القدر اہل علم کسی روایت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کر دینے کو صحیح نہیں سمجھتے اور ان تمام پہلوؤں سے اطمینان حاصل کر لینے کے بعد بھی اسے علم قطعی کے دائرے میں نہیں، بلکہ علم ظنی ہی کے دائرے میں رکھتے ہیں۔ اہل علم یہ التزام اس لیے کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے کسی مشتبہ بات کی روایت دنیا اور آخرت، دونوں میں نہایت سنگین نتائج کا باعث بن سکتی ہے۔ تاہم یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ ان تمام مراحل سے گزر کر یا گزرے بغیر اگر کوئی شخص کسی خبر واحد کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت پر مطمئن ہو جاتا ہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اسے دین کی حیثیت سے قبول کرے۔ اس کے بعد اس سے انحراف ایمان کے خلاف ہے۔ چنانچہ جناب جاوید احمد غامدی نے

بیان کیا ہے:

''...(اخبار آحاد) قرآن و سنت میں محصور اِسی دین کی تفہیم و تبیین اور اِس پر عمل کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کا بیان ہیں۔ حدیث کا دائرہ اِس معاملے میں یہی ہے۔ چنانچہ دین کی حیثیت سے اِس دائرے سے باہر کی کوئی چیز نہ حدیث ہو سکتی ہے اور نہ محض حدیث کی بنیاد پر اُسے قبول کیا جا سکتا ہے۔

اِس دائرے کے اندر، البتہ اِس کی حجت ہر اُس شخص پر قائم ہو جاتی ہے جو اِس کی صحت پر مطمئن ہو جانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل یا تقریر و تصویب کی حیثیت سے اِسے قبول کر لیتا ہے۔ اِس سے انحراف پھر اُس کے لیے جائز نہیں رہتا، بلکہ ضروری ہو جاتا ہے کہ آپ کا کوئی حکم یا فیصلہ اگر اِس میں بیان کیا گیا ہے تو اُس کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔'' (میزان ۱۵)

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com